سے کہیں وہ بھی نہیں ہے ۔

الف لیلہ کی اصل شکل ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آئی - ورنہ معلوم ہو جاتا کہ ہارون الرشید کے بعد جتنی مشہور داستانیں لکھی گئی ہیں اور افسانے بیان کئے گئے ہیں - ان پر الف لیلہ کا فیضان کتنا ہے - عرب خلفا، امرا اور وزرا کو ایک نہایت دلکش اور دلفریب کھیل بھی ہندوستان ہی سے ملا ہے - یہ شطرنج ہے - ایرانی مدعی ہیں کہ یہ وہاں سے عرب پہنچا لیکن اس میں کوئی شک نہیں معلوم ہوتا کہ بظاہر اس کے موجد ہندی ہیں ۔

عرب میں لوگ اس کے اتنے شائق ہو گئے تھے کہ شطرنجی کے لقب سے پہچانے جاتے تھے - مثلاً صولی[1] شطرنجی اور ابو حفص شطرنجی - ہارون[2] الرشید نے شطرنج کے مہرے شارلمین کو تحفے کے طور پر ارسال کئے تھے - اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شطرنج کی کتنی عظمت دلوں میں قائم تھی ۔

مختصر یہ ہے کہ ہندیوں کے تال میل سے عربوں نے جو چیز واقعی ان سے سیکھی، وہ داستان سرائی کا فن ہے، اب تک اس فن میں مشرق کا تفوق مسلّم ہے - عربوں اور ہندیوں کی داستان سرائی، خارج کر دی جائے تو مشرق کے پلے بہت کم سرمایہ رہ جاتا ہے - ایک نقاد نے کہا ہے کہ جب تک الف لیلہ باقی ہے، کسی مصنّف یا ڈرامہ نویس کو اچھا پلاٹ نہ ملنے کی شکایت نہیں ہو سکتی ۔

---

[1] و [2] ضحی الاسلام - پرتو اسلام - صفحہ ۲۸۳ -

تہذیب و تمدّنِ اسلامی

(مصنّفہ مولانا رشید اختر صاحب ندوی)

یہ کتاب اسلامی تہذیب و تمدّن سے متعلق معلومات کا خزانہ ہے - عرب کے شتربانوں نے دُنیا پر حکمرانی کرتے وقت کیا نظام کیا، اور مختلف اقوام کے فرسودہ تمدّنوں کے مقابلہ میں کس طرح ایک عالمگیر اور پائندہ تمدّن پیش کیا؟ اس کتاب پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ سب حقیقت منکشف ہو جاتی ہے - فاضل مصنّف نے انتہائی عرق ریزی سے کام لیا ہے - اور اسلامی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق لکھی ہوئی سینکڑوں عربی، فارسی، اُردو، انگریزی کتابوں کے استفادہ سے ایک نہایت جامع تصنیف پیش کر دی ہے - تمدّنِ اسلامی کے متعلق جتنا مواد اس کتاب میں یکجا کر دیا گیا ہے وہ دوسری درجنوں کتابوں میں بھی میسّر نہیں ہو سکتا۔

قیمت حصّہ اوّل پانچ روپے - حصّہ دوم چھ روپے آٹھ آنے - حصّہ سوم پانچ روپے بارہ آنے -

ملنے کا پتہ

سکریٹری - ادارۂ ثقافت اسلامیہ - ۲ - کلب روڈ - لاہور - پاکستان

محمد جعفر شاہ ندوی

ازدواجی زندگی کیلئے اہم قانونی تجاویز

(۴)

(سلسلہ کے لئے دیکھئے "ثقافت" ماہ مارچ)

خُلع

جس طرح مردوں کو طلاق دینے کا حق ہے اسی طرح عورتوں کو طلاق لینے کا بھی حق ہے۔ عدل وانصاف اور مساویانہ حقوق کا تقاضا بھی یہی ہے۔ مرد اگر اپنی عورت کو کسی وجہ سے ناپسند کرتا ہے تو طلاق دیتا ہے لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ عورت اگر اپنے مرد کو کسی وجہ سے ناپسند کرے تو وہ طلاق لے کر الگ نہ ہو جائے۔ قرآن نے یہ حق دیا ہے ارشاد ہے کہ:

فان خفتم الا یقیما حدود اللہ فلا جناح علیہما فیما افتدت بہ۔۔۔ (۲: ۲۲۹)

یعنی اگر تمہیں یہ ڈر ہو کہ یہ دونوں حدود الٰہی کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان دونوں پر اس بارے میں کوئی گناہ نہیں کہ عورت فدیہ دے دے۔

عورت کے مطالبے پر جو طلاق ہوتی ہے اس کو خُلع کہتے ہیں۔ اور جس طرح مرد کو۔۔۔ اگر وہ اپنی خوشی سے طلاق دے۔۔۔ کچھ مالی ایثار کرنا پڑتا ہے (جس کا فروری کے "ثقافت" میں ذکر آچکا ہے) اسی طرح عورت کو بھی۔ اگر مطالبۂ طلاق عورت کی طرف سے ہو۔۔۔ کچھ مالی ایثار کرنا پڑتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ مرد کو بوجہ قوی ہونے کے زیادہ ایثار کرنا پڑتا ہے یعنی مہر اور وہ تمام چیزیں جو وہ اپنی بیوی کو دے چکا ہے چھوڑنا پڑتا ہے۔ اور عورت کو بوجہ ضعیف ہونے کے صرف رقم مہر واپس کرنی پڑتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں خلعے کی تعریف یہ ہے کہ وہ ایسی طلاق ہے جو معاوضہ دے کر حاصل کی جائے۔ ایک اور فرق یہ بھی ہے کہ مرد کی طرف سے جو طلاق ہوتی ہے وہ رجعی، بائن اور مغلظ تینوں قسم کی ہو سکتی ہے[1] لیکن عورت جب بذریعۂ خلع طلاق حاصل کرتی ہے تو وہ صرف بائنہ ہوتی ہے یعنی اب اگر پھر دونوں زوجین بننا چاہیں تو زبانی یا عملی رجوع کافی نہیں ہوگا بلکہ تجدید نکاح کے بعد ہی پھر زوجین بن سکتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ تجدید نکاح تراضی طرفین کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

خُلع کی بُرائی: فروری کے ثقافت میں بسلسلہ بیانِ طلاق یہ ذکر آچکا ہے کہ ایک شکل کے سوا طلاق کی جتنی شکلیں ہیں وہ سب نہایت قابلِ نفرت ہیں اور اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں فرماتا۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ:

ابغض الحلال الی اللہ الطلاق | جائز چیزوں میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ نفرت شئے طلاق ہے۔

---

[1] ان اقسام کی تشریح فروری کے "ثقافت" میں آچکی ہے۔

بالکل اسی قسم کی وعید خلع کرانے کے متعلق بھی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ :

المختلعات هن المنافقات (ترمذی)

خلع کرنے والی عورتیں منافق ہوتی ہیں۔

ایما امرأة سألت زوجها الطلاق من غیر بأس فحرام علیها رائحة الجنة (ترمذی)

جو عورت اپنے شوہر سے کسی بُرائی کے بغیر ہی مطالبہ طلاق کرے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔

ان ارشادات نبوی کو دیکھنے کے بعد یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ جس طرح طلاق جیسی ابغض الحلال شئے سے حتی الامکان بچنا ضروری ہے اور اسی لئے اس راہ میں بہت طرح کی رکاوٹیں پیدا کی گئی ہیں اسی طرح خلع جیسی منافقانہ حرکت سے بھی جہاں تک ممکن ہو بچانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

لیکن ایک بڑی فقہی مشکل اس میں یہ حائل ہے کہ خلع میں اگرچہ ایک ہی طلاق ہوتی ہے لیکن یہ بائنہ ہوتی ہے۔ اگر رجعی ہوتی تو دوران عدت میں رجوع کا امکان باقی رہتا۔ اور زوجین کے ایک ہی گھر میں رہنے کی وجہ سے یہ امکان قوی تر ہوتا۔ لیکن بائنہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اسی وقت زوجیت سے آزاد ہو جاتی ہے اور نفقہ و سکنی اختتام عدت تک شوہر کے ذمے ہونے کے باوجود امکانِ رجوع کی کوئی شکل نہیں رہتی بجز اس کے کہ تجدید نکاح ہو۔ طلاقِ بائنہ ہونے کے بعد دونوں ایک ہی گھر میں بھی نہیں رہ سکتے کہ تجدید نکاح کے لئے سازگار ماحول پیدا ہو۔

اس لئے خلع کے طلاق بائنہ ہونے کی وجہ سے ان دفعات کی ضرورت نہیں رہتی۔ جو مرد کے طلاق رجعی دینے کے بعد ہوتی ہیں اور جن کا ذکر فروری کے "ثقافت" میں آچکا ہے۔ ہاں وہ دفعات باقی رہیں گی جن کا مقصد عورت کو اس ارادے سے حتی الامکان باز رکھنا ہے لہٰذا خلع کے لئے مندرجہ ذیل قوانین نافذ کرنے چاہئیں :

(۱) بعثت حکمین کا عمل پورا کیا جائے۔

(۲) اشہاد شاہدین بھی ہو۔

(۳) تکمیل عدت تک (خواہ یہ تین قروء[1] ہوں، یا وضع حمل) نفقہ و سکنی مرد کے ذمے ہو۔

(۴) ارضاع کی اجرت شوہر سے دلوائی جائے۔

(۵) مقدار مہر سے زیادہ مرد کو معاوضہ طلاق نہ دلوایا جائے۔

(۶) حق حضانت بدستور قائم رہے۔

(۷) تحریری تصدیق ہو۔

ان سب دفعات کی تفصیل "ثقافت" ماہ فروری کی پیش کردہ دفعات متعلقہ طلاق کی دفعہ ۱، ۴، ۷، ۸، ۹، ۱۰،

---

[1] قروء (جمع قرء) کے معنی ہیں عورتوں کے خاص ایام۔ اس کے معنی طہر کے بھی ہیں۔

۱۱ اور ۱۲ میں ملاحظہ فرمالیجئے۔ باقی دفعات ۱، ۲، ۳، ۵، ۶، ۷ اور ۱۲ کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان کا تعلق طلاقِ رجعی سے ہے۔ جو شوہر خود اپنے ارادے سے دیتا ہے۔

ایک شبہے کا ازالہ: یہ شبہہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم نے دفعات ۵ و ۶ میں لکھا ہے کہ رجعی طلاق کے سوا تمام طرح کی طلاقوں کو کالعدم قرار دینا چاہیئے۔ پھر یہاں خلعے کو طلاقِ بائن کیوں تسلیم کر لیا؟ — دراصل معاملہ یوں ہے کہ:

(۱) خلعے والی طلاق کے متعلق کوئی روایت ایسی نہیں مل سکی جس سے اس کا رجعی ہونا ثابت ہو۔ سب روایتیں بائنہ ہی ہونے کی تائید کرتی ہیں، حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ لا تکون طلقۃ بائنۃ الا فی فدیۃ او ایلاء۔ ایلا اور خلعے کے سوا کوئی طلاق بائنہ نہیں ہوتی ہے۔ (رواہ ابن ابی شیبہ عن علی وابن مسعود)۔

(۲) مرد و زن کی نفسیات میں ایک عمومی فرق یہ ہے کہ مرد ذرا ذرا سی بات پر طلاق دینے کو آمادہ ہو جاتا ہے اس لئے اسے اپنے ارادے پر نظرِ ثانی کرنے کے لئے کچھ قیود و حدود لگانی چاہئیں۔ مرد کو رجعی کا پابند بنانے میں یہ فائدہ ہے کہ اسے کئی ماہ اس کے نشیب و فراز کو سوچنے کا موقع مل جاتا ہے اور عورت کو بھی اپنی اصلاح کی مہلت مل جاتی ہے بخلاف اس کے عورت اسی وقت مطالبۂ طلاق کرتی ہے جب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو۔ اس لئے اس کا فیصلہ آخری فیصلہ سمجھنا چاہیئے۔ البتہ اسے اس ارادے سے باز رکھنے کے لئے بعث حکمین، اشہاد شاہدین، ولایتِ مہر، رجوع الی القاضی اور انتظارِ عدت کا خیال کافی موانع ہیں۔

ایک دوسرا شبہہ: خلع کی آیت اوپر نقل کی جا چکی ہے فان خفتم شقاق بینھما الخ۔ اس کا انطباق (APPL CATION) عہدِ نبوت میں پہلی بار یوں ہوا کہ جمیلہ بنت عبداللہ بن اُبی نے جو ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی تھیں حضورؐ سے عرض کیا کہ: ما أعتب ثابتا فی خُلق ولا دین ولکن اکرہ الکفر فی الاسلام یعنی مجھے ثابتؓ سے کوئی اخلاقی و دینی شکوہ نہیں لیکن میں اسلام میں کفر (منافقانہ محبّت) کو ناپسند کرتی ہوں۔ چنانچہ حضورؐ نے ثابت سے کہا کہ اپنا باغ (جو مہر میں دیا ہے) واپس لے لو اور جمیلہ کو طلاق دے دو۔ (بخاری ونسائی عن ابن عباس)، اسی طرح ثابت کی بدصورتی اور مارنے کی شکایت ان کی دوسری بیوی حبیبہ بنت سہل نے بھی کی اور حضورؐ نے ان کو بھی ثابت سے جدا کرا دیا۔

اس روایت کو دیکھ کر یہ شبہہ کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ نے صرف ایک معمولی ناپسندیدگی کو بنا قرار دے کر تفریق کرا دی نہ کوئی رکاوٹ پیدا کی نہ اسے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا اور یہاں ہم نے کئی دفعات اس سے باز رکھنے کے لئے پیش کی ہیں — اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ:

(۱) طلاق کی طرح خلعے کو بھی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے (جیسا کہ اوپر گزر چکا) اس لئے طلاق کی طرح خلعے میں رکاوٹیں پیدا کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ خلعے کا اختیار ہی سلب کر لیا جائے۔ بلکہ غرض یہ ہے کہ ان پابندیوں کی وجہ سے خلعے کے غلط استعمال کا سدِ باب ہونے کی توقع ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ جمع تفریق پر مقدم ہے۔ طلاق میں رکاوٹیں پیدا کرنے کا جو مقصد ہے وہی مقصد یہاں بھی ہے۔

(۲) اگر یہی ہے تو طلاق میں بھی یہ رکاوٹیں نہ ہونی چاہئیں کیونکہ عہد نبوت میں کوئی نظیر بعث حکمین، اشہاد و شاہدین وغیرہ کی بھی نہیں ملتی۔

(۳) اگر حدیث کی بنا پر یہ فیصلہ کرنا ہے تو پھر خلعے میں اس پر بھی عمل ہونا چاہئیے کہ اس کی عدت فقط ایک قرء ہو کیونکہ ابن عباس ہی سے ابو داؤد و ترمذی میں یہ روایت بھی ہے کہ:

ان امراۃ ثابت بن قیس بن شماس اختلعت من زوجہا علی عہد النبی صلے اللہ علیہ وسلم فامرہا النبی صلے اللہ علیہ وسلم ان تعتد بحیضۃ۔

جمیلہ نے جب ثابت سے خلع کیا تو حضورؐ نے جمیلہ کو صرف ایک قرء کی عدت گزارنے کا حکم دیا۔

یہی شکل رُبیّع بنت معوذ کے ساتھ بھی ہوئی۔ ان کے خلعے کے بعد بھی ایک ہی قرء کی عدت گزارنے کا حکم ہوا (ترمذی)

علاوہ ازیں نسائی کی مندرجۂ بالا روایت میں یہ بھی ہے کہ فطلقہا تطلیقۃ۔ یعنی ثابت نے جمیلہ کو ایک طلاق دی تھی ظاہر ہے کہ ایک طلاق رجعی ہوتی ہے اور عدت گزرنے کے بعد بائنہ ہوتی ہے۔

اب دیکھئے جب ان روایتوں کے ہوتے ہوئے جمہور فقہا اس طلاق کو بائنہ اور اس کی عدت کو تین قروء بناتے ہیں تو خلعے کی کراہیت کے پیش نظر اس سے باز رکھنے کے لئے کچھ قیود کیوں نہیں لگائی جا سکتیں؟

ایک مشکل کا حل: خطابی طاؤس، عکرمہ، احمد بن حنبلؒ، اسحاق اور ابو ثور ابن حزم اور ابن قیمؒ اور ایک ضعیف روایت میں حضرت علیؓ و امام شافعیؒ بھی اس خلعے والی تفریق کو فسخ نکاح قرار دیتے ہیں اور ان کی مختلف دلیلوں میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے اگر یہ طلاق بائن ہوتی تو مدت فقط ایک قرء کی بجائے تین قروء ہوتی۔ ان حضرات کے علاوہ جمہور صحابہ، تابعین اور فقہا اس تفریق کو طلاق بائن اور عدت تین قروء بتاتے ہیں۔ (تاج الاصول)

ہمارے خیال میں معاملہ یوں ہے کہ عورت کے مطالبۂ طلاق پر قاضی شوہر سے طلاق دینے کو کہے گا۔ اگر وہ طلاق دیدے تو یہ طلاق بائنہ ہوگی اور عدتِ طلاق تین ہی قروء ہوگی۔ لیکن اگر وہ طلاق دینے پر راضی نہ ہو تو قاضی اپنے اختیاراتِ خصوصی سے نکاح کو فسخ کر دے گا اور اس صورت میں اس فسخ نکاح کی عدت ایک ہی قرء ہوگی۔ ثابت والی روایت سے تو یہ بات ثابت نہیں ہوتی کیونکہ ان کے طلاق دینے کے باوجود عدت کے لئے ایک ہی قرء گزارنے کا حکم ہوا لیکن دونوں مسلکوں کو جمع کرنے کی ہمارے خیال میں یہی صورت ہے جو ابھی لکھی گئی۔

ترکہ

عورتوں کو خواہ وہ بیوی ہو یا بیٹی یا ماں قرآن نے ترکہ دلوایا ہے اور ان سب کے حصوں کی تعیین کر دی ہے لیکن موجودہ معاشرے میں اس پر عمل بہت کم ہوتا ہے۔ حکومت اسلامیہ کا فرض ہے شرعی تقسیم ترکہ کے متعلق حکم نافذ کرے۔ حصوں کے متعلق صرف چند نکات ہیں جن کو مختلف فیہ کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً یتیم پوتے پوتی کی وراثت، عول، وصیت اور عصبات وغیرہ۔ اس وقت

ان مسائل پر یا فلسفۂ میراث پر کوئی بحث مقصود نہیں۔ اِس وقت تو حقوقِ نسواں کے سلسلے میں وراثت سے تعلق رکھنے والی چند بحازیز کو نافذ کرانا مقصود ہے۔ ہماری رائے میں مندرجۂ ذیل قوانین سر دست نافذ کر دینے چاہئیں :۔

(۱) عورتوں کے جو حصّے قرآن نے مقرر کئے ہیں وہ ان کو دینے ضروری ہیں۔

(۲) بیوہ کی عدّت (چار ماہ دس دن یا ولادت) کے دَوران میں اخراجات شوہر کے مال سے ہوں گے اور یہ اس کے حصّۂ وراثت کے علاوہ ہوں گے۔

(۳) متوفی شوہر ایک سال کے اخراجات کی وصیت کر جائے۔ اگر وصیّت نہ بھی کرے تو ایک سال کی وصیّت سمجھ لی جائے۔ اور یہ ایک سال کے اخراجات بھی بیوہ کے حصّۂ وراثت کے علاوہ ہونگے بشرطیکہ بیوہ اپنے متوفی شوہر ہی کے گھر میں رہے

(۴) اگر عدّت کے بعد بیوہ عقدِ ثانی کرے یا شوہر کا گھر چھوڑ دے تو شوہر کے مال سے اس کے اخراجات اسی وقت سے بند ہو جائیں گے۔

(۵) ایک سال تک اگر وہ عقدِ ثانی نہ کرے تو اس کے بعد اس کے اخراجات کا بار شوہر کے مال پر نہ پڑے گا۔

قرآن کریم میں بیوہ کی عدّت گزارنے احکام یوں ہیں :

(الف) والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعة اشھر وعشرا.... (۲ : ۲۳۵)

اور تم میں سے جن کی وفات ہو جائے اور وہ بیبیاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنے آپ کو چار ماہ دس دن انتظار میں رکھیں۔

(ب) واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن

حاملاؤں کی عدّت وضعِ حمل تک ہے

پس عدّت خواہ چار ماہ دس دن ہو یا تاحین ولادت دونوں کے اختتام تک کے اخراجات شوہر ہی کے ذمے یعنی اس کے مال سے اُسی طرح ہوں گے جس طرح مطلقہ یا مختلعہ (خلع کرنے والی) کے اخراجات شوہر کے ذمے ہوتے ہیں (جس کا ذکر طلاق کے بیان میں آچکا ہے) ۔۔ ظاہر ہے کہ شوہر کے مال میں اس کا یہ حق حصّہ وراثت کے علاوہ ہے کیونکہ وہ اسی کے سوگ میں ہے یا اس کے بچے کو اپنے شکم میں پرورش کر رہی ہے۔ جب خلع والی تفریق میں (جو طلاق بائن ہے اور جس میں بیوی کا شوہر سے کوئی تعلق نہیں رہ جاتا) عدّت کے اخراجات شوہر کے مال سے ہوتے ہیں۔ تو بیوگی کی عدّت میں کیوں نہ ہوں ؟ صرف عدّت کے اخراجات ہی نہیں بلکہ وہ ان تمام رعایتوں کی حقدار ہے جن کا ذکر طلاق کے بیان میں آچکا ہے۔ مثلاً ارضاع وحضانت وغیرہ (دیکھو دفعہ ۸ تا ۱۱)

ہاں اگر وہ بعد عدّت عقدِ ثانی کرے تو ظاہر ہے کہ ترکے کے سوا دُوسرے ان حقوق سے وہ محروم ہو جائے گی جو شوہرِ اوّل کے ذمے ہوتے ہیں۔

اَب رہا ایک سال تک کے اخراجات کی وصیت کا معاملہ تو قرآنِ پاک میں ایسی وصیّت کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے :

والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا وصیۃ لازواجھم متاعا الی الحول غیر اخراج

فان خرجن فلا جناح علیکم فی ما فعلن فی انفسھن من معروف ...... (۲ : ۲۴۰)

جو لوگ مرنے لگیں اور بیبیاں چھوڑ جائیں انھیں ان بیبیوں کے لئے ایک سال کے اخراجات کی وصیت کر جانی چاہئے

گھر سے نکالے بغیر۔ ہاں اگر وہ خود (بعد عدت) چلی جائیں تو جو معقول فیصلہ وہ اپنے حق میں کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔

ہماری معاشرتی زندگی میں اس آیت کو ذرہ برابر بھی کوئی عملی اہمیت حاصل نہیں حالانکہ منشائے آیت صاف ہے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ مرنے والے ایسی وصیت کر جائیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر اس کو وصیت کا موقع نہ ملے ۔۔۔ خواہ قصداً ہو یا سہواً یا اچانک موت کے باعث ہو ۔۔۔ تو کیا اس آیت کے حکم سے بالکل قطع نظر کر لینا چاہیئے؟ جہاں تک ہم غور کر سکے ہیں بات یوں ہے کہ دوران عدت میں پیغام نکاح دینا بھی ناجائز ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے:

ولا تعزموا عقدۃ النکاح حتی یبلغ الکتب اجلہ

جب تک عدت ختم نہ ہو بیوہ یا مطلقہ کے نکاح کا ارادہ بھی نہ کرو۔

اب ظاہر ہے کہ عدت کے دوران میں پیغام بھی نہیں دیا جا سکتا اور عدت ختم ہوتے ہی فوراً نکاح نہیں ہو جاتا۔ کچھ دن لگ ہی جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ کوئی شرافت نہیں کہ عدت ختم ہوتے ہی بیوہ کو بیک بینی و دو گوش گھر سے باہر نکال دیا جائے۔ کچھ مدت اور بھی اس کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہیئے۔ یہ حسن سلوک زیادہ سے زیادہ کتنی دیر ہو؟ اسی سوال کا جواب اس آیت میں ہے کہ یہ مدت کم از کم عدت کے دن ہیں اور زیادہ سے زیادہ ایک سال۔ ایک سال تک مہلت دینے کی ایک بڑی مصلحت یہ بھی ہے کہ اگر چار ماہ دس دن تک یہ معلوم ہو جائے کہ یہ بیوہ حاملہ ہے تو ولادت اور زچگی وغیرہ کی مدت ملا کر تقریباً ایک سال پورا ہو جائے گا اس کے بعد وہ عقد ثانی کرے گی۔

پس جب یہ وصیت ضروری ہے ۔۔۔ خواہ ثلث مال ہی میں سے ہو ۔۔۔ تو اس کے نفاذ کی یہ شکل نہیں کہ اگر شوہر وصیت کرے تو پوری کی جائے اور نہ کرے تو نہ پوری کی جائے۔ اگر وہ وصیت نہ بھی کر سکے تو یہ فرض کر لینا چاہیئے کہ اسکی وصیت نافذ العمل ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وصیت تو والدین اور اقربین کے لئے بھی فرض ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے:

کتب ...... الوصیۃ للوالدین والاقربین۔

والدین اور دوسرے قرابتداروں کے لئے بھی وصیت فرض ہے۔

لہذا اگر بیوی کے حق میں وصیت کو نافذ فرض کر لیا جائے تو والدین اور دوسرے اقربین کے حق میں بھی وصیت کو ۔۔۔ خواہ وصیت کی نہ گئی ہو ۔۔۔ نافذ فرض کر لینا چاہیئے ۔۔۔

سوال تو واقعی اہم ہے لیکن بات یہ ہے کہ بیوی کے ساتھ یہ رعایت ایک محدود مدت تک ہے وہ بھی اس صورت میں کہ وہ اپنا کوئی نیا رشتہ نہ کرے یہ سب کچھ اس کی عدت کی مجبورانہ حالت بے بسی کی رعایت ہے۔ اور بعض اوقات یہ بھی